

# اطاعت کا قرآنی تصور

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن  
لاہور

# اطاعت کا قرآنی تصور

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ایک درس قرآن سے ماخوذ

ترتیب

حافظ خالد مسعود خضر



مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36-کے، ملل ٹاؤن، لاہور ○ فون : 3-5869501

نام کتاب \_\_\_\_\_ اطاعت کا قرآنی تصور

بار اول (اکتوبر ۱۹۹۵ء) \_\_\_\_\_ ۱۱۰۰

بار دوم (جون ۱۹۹۸ء) \_\_\_\_\_ ۱۱۰۰

بار سوم (جنوری ۲۰۰۳ء) \_\_\_\_\_ ۲۲۰۰

ناشر \_\_\_\_\_ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت \_\_\_\_\_ ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۳-۵۸۶۹۵۰۱

مطبع \_\_\_\_\_ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت \_\_\_\_\_ روپے ۱۰

## اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

اَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا  
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (التغابن: ۱۲)

”اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ پھر اگر تم روگردانی کرو تو جان لو کہ ہمارے رسول پر سوائے پہنچا دینے کے کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔“

### سورۃ التغابن کے مضامین کا تعارف

سورۃ التغابن دو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے رکوع میں ۱۰ اور دوسرے رکوع میں ۸ آیات ہیں۔ پھر پہلے رکوع کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ملامت کا بیان ہے۔ یعنی خبریہ (Narrative) انداز میں توحید، معاد اور رسالت جیسے حقائق کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اگلی تین آیات (۸ تا ۱۰) دعوتِ ایمان پر مشتمل ہیں کہ ان حقائق پر ایمان لاؤ، انہیں مانو، انہیں تسلیم کرو۔ دوسرے رکوع کی آٹھ آیات میں سے پہلی پانچ آیات ایمان کے ثمرات و نتائج اور اس کے مضمرات پر مشتمل ہیں۔ حقیقی ایمان اگر دلوں میں جاگزیں اور ذہن و فکر کے اندر پیوست ہو گیا ہو، رنج بس گیا ہو تو اس کے کچھ ثمرات و نتائج نکلنے چاہئیں، جیسا کہ ایک مقولہ ہے کہ ”درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے“۔ چنانچہ قلب کے اندر اگر وہ مخفی حقیقت جس کا نام ”ایمان“ ہے، موجود ہے تو اس کی پہچان جن ثمرات و نتائج سے ہوتی ہے انہیں ان پانچ آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر آخری تین آیات میں ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بڑی پُر زور دعوت دی گئی ہے۔

## آیت زیر درس کا محل و مقام

دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات جن میں ایمانیت کے مضمرات کو واضح کیا گیا ہے، ان میں سے چار آیات کا تعلق انسان کے فکر و عمل سے ہے۔ یعنی ایمان حقیقی حاصل ہونے کے بعد انسان کی سوچ اور اس کے زاویہ نگاہ میں کیا انقلاب آنا چاہئے اور اس کے باطنی احساسات میں کیا تبدیلی آنی چاہئے۔ جب اس نے اللہ کو مانا ہے تو اسے اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہئے، اسے تسلیم و رضا کی کیفیت کا حامل ہونا چاہئے اور اللہ سے کسی شکوہ و شکایت یا ناراضگی کی کیفیت میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح اس کا سارا دار و مدار، بھروسہ، توکل اور تکیہ اسباب و وسائل پر نہیں، بلکہ سبب الاسباب یعنی ذات باری تعالیٰ پر ہو جانا چاہئے۔ پھر یہ کہ دنیا میں جتنی بھی چیزوں سے اس کا تعلق ہے، خواہ وہ کہ جن سے اس کا سلسلہ حیات وابستہ ہے، یعنی معاشی اسباب و ذرائع وغیرہ، خواہ وہ علاقائی دنیوی کے زمرے سے ہوں، ان کے بارے میں اس کے نقطہ نظر میں واضح تبدیلی آنی چاہئے۔ انسان کو آگاہ رہنا چاہئے کہ جہاں محبت ہو وہیں خطرہ ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی اولاد، والدین، اعزہ و اقارب اور بیویوں (اور بیویوں کو شوہروں) سے جو طبعی محبت ہے یہی درحقیقت خطرے کی علامت ہے۔ یہ محبت اگر ایک حد کے اندر رہے، یعنی اللہ کی محبت کے تابع رہے تو صحیح ہے، درست ہے، لیکن اگر یہ اس حد سے بڑھ جائے تو انسان کی عاقبت برباد ہو جاتی ہے۔ یہ ہے نقطہ نظر کی وہ تبدیلی جو ایمان کا تقاضا ہے۔ یعنی مال و اسباب دنیوی اور اولاد کو ایک فتنہ و آزمائش سمجھنا چاہئے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہمیں آزار رہا ہے۔ چنانچہ ان پانچ آیات میں سے چار آیات انسان کے فکر و نظر کی تبدیلی کے بیان پر مشتمل ہیں، جبکہ صرف ایک آیت عمل سے متعلق ہے۔ اور یہی وہ آیت ہے جو ہماری آج کی گفتگو کا مرکز و محور ہے:

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَى  
رُسُلِنَا الْمَسئَلُ ۝

”اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے) رسول کی۔ پھر اگر تم روگردانی

کرو تو جان لو کہ ہمارے رسول پر سوائے پچھانے کے کوئی ذمہ داری نہیں۔“

رسول ﷺ کی ذمہ داری اللہ کے احکام پچھاننا ہے۔ اس کے بعد ان احکام پر عمل کرنا

سراسر تمہاری اپنی ذمہ داری ہے اور اس کی جو ابدی خود تمہیں کرنی ہوگی۔ جس طرح ایمانی حقائق تو اپنی جگہ اٹل ہیں، کوئی مانے تب بھی اور کوئی نہ مانے تب بھی، لیکن انہیں ماننے میں تمہاری فلاح و کامیابی ہے، اسی طرح اللہ کے احکام تو اپنی جگہ برحق ہیں، واجب التعمیل ہیں، لیکن تمہیں ان پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اگر تم ان پر عمل کرو گے تو اس میں تمہاری فلاح و نجات اور اللہ کی رضا ہے۔

اطاعت کے مضمینات  
 نظر آتا ہے، اس لئے کہ ایک لفظ ”اطاعت“ میں شریعت کے تمام ادا مرد و نواہی سمیں۔  
 جب یہ کہا جاتا ہے کہ ”اللہ کا حکم مانو“ تو اس سے مراد اللہ کے تمام احکام ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ کا حکم نماز پڑھنے کا بھی ہے، رمضان کے روزے رکھنے کا بھی ہے، صاحبِ نصاب ہونے کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی ہے، اور صاحبِ استطاعت کے لئے حج کرنے کا بھی ہے۔ پھر یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ اس کے دین کی دعوت دو، دین کی تبلیغ و اشاعت کرو، نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو، یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ حلال کو حلال جانو اور حرام کو حرام جانو، حلال پر قناعت کرو اور حرام سے اجتناب کرو اور یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ دین کے لئے جماد کرو، کلہر حق کو، عدل و قسط پر قائم رہو، حق کے علمبردار بن جاؤ، انصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ۔۔۔ اور اللہ کے دین کو قائم کرو اور پھر یہ کہ اس کے لئے جان کھپاؤ، مال کھپاؤ، اور اگر ضرورت پڑے تو نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جاؤ۔۔۔ یہ سب احکام ہی تو ہیں، لیکن ہمارا الہ یہ ہے کہ قرآن میں جہاں اللہ کا حکم ماننے کی بات ہوتی ہے ہمارا ذہن

نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سے آگے کچھ نہیں سوچتا۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ سور نہیں کھانا، شراب نہیں پینا اور زنا نہیں کرنا۔ اس سے آگے اللہ کا کوئی حکم ہمارے سامنے ہے ہی نہیں۔

ہمارے ہاں عمل کا جو سارا فساد پیدا ہوا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ تو ایمان کا فقدان ہے۔ جس چیز کو ایمان سمجھا جاتا ہے وہ محض ایک موروثی عقیدہ (Racial Creed) ہے جو ماں باپ کی طرف سے چلا آ رہا ہے۔ حقیقی ایمان کا حال تو یہ ہے کہ ”وہوینڈ اب اس کو چراغِ رخِ زیبالے کہا“ کے مصداق تلاش کرنے پر بھی شاید کہیں نظر آجائے۔ پھر یہ کہ جہاں ایمان کچھ موجود بھی ہے وہاں فرائض کا تصور محدود ہے اور سارے کا سارا ایمانی جوش و جذبہ انہی ”عبادات“ کے اندر پورا ہو جاتا ہے۔ جوں جوں ایمانی جذبہ ترقی کرتا ہے تو انسان فرائض کے بعد مستحبات و نوافل میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ اللہ کے احکام تو سب کے سب برابر ہیں، اللہ کا حکم جس طرح زنا اور شراب کی حرمت کا ہے اس سے کہیں بڑھ کر سود کی حرمت کا بھی ہے اور یہ کہ اگر وہ اللہ کے احکام میں کہیں اپنی پسند اور مرضی سے یا اپنی سہولت اور مصلحت کی خاطر ذرا سی بھی تفریق اور تقسیم کر لے تو اس طرز عمل کے لئے قرآن میں سخت وعید آئی ہے :

اَفْتَرْتُمْ مِّنْ وَّجْهِ بَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضِ ۗ فَمَا جَزَاءُ مَنۢ  
يَفْعَلُ ذٰلِكَ مِثْلَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۗ اَلَا يَعْرِضُوْنَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ  
يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا لِلّٰهِ بِعَاقِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

”کیا تم ہماری کتاب (و شریعت اور ہمارے اوامر و نواہی) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے؟ تو کوئی سزا نہیں ہے اس کی جو تم میں سے یہ روش اختیار کرے سوائے اس کے کہ اسے دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔ اور اللہ قافل نہیں اس سے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو!“

اس اعتبار سے آپ غور کیجئے کہ ”اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ“ کہنے کو تو دو چھوٹے چھوٹے جملے جملے ہیں، لیکن ان میں ایک قیامت مضمحل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں قرآن

کی اوٹ میں پھاڑ موجود ہے۔ شریعت کے تمام اوامر و نواہی اور تمام دینی ذمہ داریوں کا ذکر ان چند الفاظ میں موجود ہے :

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

”اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی“

اس کے ساتھ ہی بڑے استفتاء کے انداز میں یہ فرما دیا گیا کہ اگر تم نے روگردانی کی، پیٹھ دکھائی، اعراض کیا، انکار کیا تو اس میں اللہ کا کوئی نقصان ہے نہ اس کے رسولؐ کا :

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ۝

”پھر اگر تم نے روگردانی کی تو جان لو کہ ہمارے رسولؐ کی ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے“

رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذمہ داری اور فرمادی، وہ فارغ ہوئے، اب عمل کی ذمہ داری تمام تر تم پر ہے، اور اگر تم اس میں کوتاہی کرو گے تو اللہ کی کوئی احتیاج تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے، اس کا کوئی کام تمہاری اطاعت کے بغیر رکھا ہوا نہیں ہے، جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں الفاظ آئے ہیں کہ :

”اے میرے بندو، اگر تمہارے اولین بھی اور آخرین بھی، انسان بھی اور جن بھی، سب کے سب اتنے متقی ہو جائیں جتنا کہ تم میں کوئی بڑے سے بڑا متقی ہو سکتا ہے، تب بھی میری سلطنت اور میرے کارخانہ قدرت میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔۔۔۔ اور اگر تمہارے اولین و آخرین اور انیس و جن سب کے سب ایسے ہو جائیں جتنا کہ تم میں کوئی زیادہ سے زیادہ سرکش و نافرمان ہو سکتا ہے، تب بھی میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔“ (یہ حدیث حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے اور صحیح مسلم میں مذکور ہے۔)

معلوم ہوا کہ اللہ تو غنی ہے، إِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ، لیکن اس کے احکامات کی پابندی میں خود ہماری خیر اور بھلائی ہے۔

آیت زبردس کے مطالعہ کا آغاز کرنے سے پہلے یہ نسبت و تناسب ذہن میں ایک بار پھر تازہ کر لیجئے کہ یہاں فکر و نظر کی تبدیلی پر چار آیات اور دعوتِ عمل پر صرف ایک آیت آئی ہے، اس لئے کہ تمام فرائض کی ادائیگی اور تمام اوامر و نواہی کی پابندی کا دار و مدار ہی



فکرو نظر کی تبدیلی پر ہے۔ یہ تبدیلی گمراہی اور گمراہی کے اعتبار سے جس قدر زیادہ ہوگی، اس کے اندر جس قدر زیادہ پختگی اور دوام ہوگا اور ایمان حقیقی جس قدر قلب کی گمراہیوں میں راسخ اور فکرو نظر میں پیوست ہو جائے گا اسی قدر انسان کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کر سکے۔ لہذا یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم کے درجے میں ہیں۔ اب ہم اس آیت مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں۔

### آیات قرآنی کی روشنی میں اطاعت کا مفہوم

قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں لفظ ”اطاعت“ اس سے قبل صرف ایک جگہ یعنی سورہ لقمان کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت لقمان کی نصائح میں جو اضافہ کیا گیا اس میں یہ مضمون آیا ہے کہ اگر مشرک والدین تم پر وباؤ الہیں کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو تو ان کی اطاعت مت کرو وہاں الفاظ آئے ہیں : فَلَا تُطِيعُهُمْ مَا كَمَا مَتَّانُوْا بِمَا هُمْ اُولٰٓئِكَ لَیْنِ اِگر وہ اپنے شکر کے فوراً بعد والدین کے شکر کو لازم قرار دیا (اشکرت لربی و لوالدینک) لیکن اگر وہ اپنے اس مقام سے مزید بلند ہو کہ اللہ سے بھی بالاتر ہونا چاہتے ہیں اور اللہ کے احکام کے خلاف کوئی حکم دینا چاہتے ہیں تو ان کا کہنا نہیں مانا جائے گا، کیونکہ ”لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ“ یعنی جس معاملے میں اللہ کی معصیت لازم آتی ہو اس معاملے میں مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔۔۔۔۔ لیکن اصلاً یہ آیت مبارکہ (آیت زبرد رس) ہمارے منتخب نصاب میں اطاعت کی تاکید پر مشتمل پہلا مقام ہے۔

لفظ اطاعت اگرچہ عام طور پر کسی بھی حکم برداری، فرمانبرداری، کسی کے حکم کو مان لینے اور اس کی تعمیل کے لئے استعمال ہو جاتا ہے، چاہے وہ برضا و رغبت اور دلی آمادگی سے ہو، چاہے بالجبر ہو، لیکن دراصل اس لفظ کا مادہ ”طوع“ ہے جو ”کرہ“ (مجبوری یا کراہت کے ساتھ کسی کا حکم ماننا) کی ضد ہے۔ چنانچہ یہ لفظ (طوع) قرآن حکیم میں ”کرہ“ کی ضد کے طور پر تین مقامات پر آیا ہے :

(۱) سورہ آل عمران کی آیت ۸۳ میں فرمایا :

وَلَهُ اسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا

کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی مخلوقات ہیں وہ سب کی سب اللہ کے حضور میں جھکی ہوئی ہیں، اس کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں، دلی آمادگی کے ساتھ بھی اور کراہت کے ساتھ بھی۔۔۔ کیونکہ ان کے لئے کوئی اور چارہ کار ہے ہی نہیں۔ خود ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے وجود کا اکثر و بیشتر حصہ جبر اللہ کی اطاعت کر رہا ہے، اس لئے کہ ہمارے اس جسمانی وجود کی پوری فزیالوجی اور پورا جسمانی نظام اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ ہم تو اس پر بھی قادر نہیں کہ اپنی مرضی سے اپنے جسم کے کسی حصے پر بالوں کا اگنا بند کر دیں۔ البتہ جہاں اس نے ہمیں اپنا اختیار استعمال کرنے کی کچھ اجازت دی ہے وہاں اگر ہم اپنے اختیار سے اس کے دیئے ہوئے اختیار کو اسی کے قدموں میں ڈال دیں تو یہی ہماری کامیابی ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس اعتبار سے ”طوع“ اور ”کرہ“ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(۲) اسی طرح سورۃ الرعد کی آیت ۱۵ جو آیت مجہدہ ہے، کے الفاظ ہیں :

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا

کہ اللہ کے لئے سجدے میں گری ہوئی ہے ہر شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، طوعاً بھی اور کرہاً بھی۔۔۔ یعنی بطوع خاطر اور بطیب خاطر، دلی آمادگی کے ساتھ بھی اور جبری طور پر بھی۔ کسی کامی چاہے یا نہ چاہے اسے اس کی اطاعت تو کرنی ہے۔

(۳) سورۃ ہم السجدہ (آیت ۱۱) میں ”طَوْعًا اَوْ كَرْهًا“ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی

حرف عطف ”و“ کے بجائے ”اَوْ“ لایا گیا ہے جو واضح کرتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسری کی ضد اور متقابل ہیں۔ فرمایا گیا :

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ اُنْسِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا

کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین دونوں کو حکم دیا کہ چلے آؤ، طوعاً یا کرہاً، چاہے اپنی مرضی سے، چاہے مجبوری سے۔ یہ احکام ہیں جو ہم نے تمہارے لئے طے کر دیئے ہیں، اب چاہے

اپنی دلی خواہش سے اس پر عمل پیرا ہو چاہے جبراً ان پر عمل کرو، بہر حال یہ تو تمہیں کرنا ہی ہے!

## ایمان اور اطاعت کا باہمی تعلق

مذکورہ بالا تین آیات کے بعد ایک آیت سورۃ الاحزاب کی ملاحظہ فرمائیے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ میں دین کے عملی تقاضوں کا بیان ہے۔ اس کے بعد آیت ۳۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونُوا لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

”کسی مؤمن مرد اور کسی مؤمن عورت کے یہ شایانِ شان ہے ہی نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ فرمادیں تو پھر بھی اپنے معاملے میں ان کے پاس کوئی اختیار باقی رہ جائے۔“

یعنی اگر یہ احساس ابھرے بھی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کے بعد بھی میرے پاس کچھ اختیار اور چوائس موجود ہے تو پھر ایمان کہاں رہا؟ اس سے تو ایمان کی نفی ہو گئی۔ جب اللہ اور اس کے رسول کو مانا ہے تو اپنا اختیار ختم ہو گیا۔ ہاں جب تک کوئی حکم نہ آئے، یا فرض کریں حکم تو موجود ہے لیکن آپ کے علم میں نہیں آیا تو آپ کا اختیار برقرار ہے۔ آپ اللہ کے ہاں اس سے اپنی بناواقفیت کے عذر کو پیش کر سکیں گے اور جن کے ذمہ آپ تک یہ حکم پہنچانا تھا وہ مسئول ٹھہریں گے۔۔۔ لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ یہ اللہ کا حکم ہے، یہ اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہے، یہ سمجھنا کہ اب بھی اس معاملے میں میرا اختیار باقی ہے، ایمان کے منافی طرزِ عمل ہے۔ آیت کا آخری ٹکڑا ہے:

وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ صِلًا لَا مَبِيَّاتًا

”اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا ارتکاب کرے گا تو وہ جان لے کہ وہ توبہ کی صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔“

اللہ تعالیٰ مجھے، آپ کو اور تمام اہل ایمان کو ایسے سے بچائے۔

ہر انسان کی انفرادی شخصیت کے ڈورِ رخ ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ حالات و کیفیات، خواہ

خوش گوار ہوں یا ناگوار، اس پر وارد ہوتی ہیں، اگرچہ یہ اسباب و وسائل کے ایک طویل سلسلے کے ذریعے سے اس تک پہنچیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس کے تمام اعضاء و جوارح سے کچھ نہ کچھ صادر یا خارج ہوتا ہے۔ ہم زبان سے بات کرتے ہیں تو اس کے لئے ہمارے دماغ کا ایک بڑا حصہ، عضلات کا ایک پورا سلسلہ اور ہماری زبان اور ہونٹ کام کرتے ہیں، تب کہیں جا کر الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پر جو کچھ وارد ہو، خواہ وہ کسی بھی سلسلہ اسباب سے ہو کر آ رہا ہو، سمجھا جائے کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ درمیان میں عمل کرنے والا ذمہ دار نہیں رہا، اگر ظلم کر رہا ہے تو اسے اس کے ظلم کی سزا دی جائے گی، البتہ ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ بغیر اذن رب ہم پر کوئی شے وارد نہیں ہو سکتی۔ لیکن دوسری طرف جو کچھ ہم سے صادر ہو رہا ہے وہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھل کر صادر ہونا چاہئے۔ اس کے لئے مجھے فانی کا یہ اندازِ تعبیر بہت پسند ہے۔

فانی ترے عمل ہم تن جبر ہی سی

سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اس شعر میں جبریہ کے نقطہ نظر کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے، اگرچہ ہم اس موقف کو صد فیصد درست نہیں سمجھتے۔ انسان میں اللہ تعالیٰ نے ایک قدرت بھی رکھی ہے اور اسے اختیار بھی دیا ہے کہ اِمَّا سَاكِرًا وَاِمَّا كَافِرًا۔۔۔ لیکن ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مخاری کی

چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہ ایک پورے فلسفیانہ مکتب فکر کا نظریہ ہے، جسے فانی نے اپنے شعر میں بیان کر دیا ہے، لیکن بہر حال ان کے نزدیک انسانی اعمال کا معاملہ یہ ہے کہ۔

سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اسی کو غنیمت سمجھو کہ تمہیں تمہارے خالق نے اختیار کا ایک احساس تو دیا ہے اور تم یہ محسوس کرتے ہو کہ میں یہ اپنی مرضی سے کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ فانی کے اس اندازِ تعبیر کو اختیار

کرتے ہوئے میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے اعمال کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں اٹھلے ہوئے ہونا چاہئے۔ ہمارا ہر عمل خواہ وہ آنکھ سے ہو رہا ہو ہاتھ سے ہو رہا ہو یا زبان سے ہو رہا ہو اس کے بارے میں ہمیں محتاط رہنا چاہئے کہ وہ اطاعت کے اس سانچے سے باہر نہ رہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اعمال غیر اختیاری طور پر بھی صادر ہو جاتے ہیں، مثلاً راہ چلنے کوئی ایسی آواز آپ کے کانوں میں پڑ گئی جس کا پالارادہ سننا گناہ ہے، یا چاک کسی نامحرم پر نگاہ پڑ گئی، لیکن یہی اعمال اگر اپنے ارادہ و اختیار سے کئے جائیں تو ان کی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں بھی آپ کے اختیار کا سانچہ موجود ہے اس میں سے برآمد ہونے والا ہر عمل گویا اللہ اور رسول کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہونا چاہئے۔

ارادہ و عمل کے اختیار کے بارے میں ایک متوازن نقطہ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہمیں جو اختیار حاصل ہے وہ اتنا زیادہ بھی نہیں ہے جتنا عام آدمی سمجھتا ہے، بلکہ ہماری مجبوری کا پلو بھی یقیناً بہت بڑا ہے۔ مثلاً ہمارا Genetics کا نظام ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمیں جو جینز (Genes) ملے ہیں جن سے ہمارے جسمانی نقش و نگار اور ہماری شخصیت کے خد و خال تیار ہوئے ہیں وہ ہمارے خالق کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور ہمیں اس معاملہ میں کسی انتخاب و اختیار کا حق نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اعتبارات سے ہم مجبور ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انسانی شخصیت میں اختیار کا ایک عنصر بہر حال موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ عنصر جس مقدار میں رکھا ہے اسی نسبت سے وہ اس کا عاصبہ کرے گا۔ ”أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ“ کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ نے جو بھی اختیار دیا ہے اسے اپنے اختیار سے اس کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔

اب ظاہر بات ہے کہ اطاعت پر ہی ایمانِ حقیقی کا دارومدار ہے۔ اگر اطاعت موجود ہے تو ایمان موجود ہے، اور اگر اطاعت نہیں ہے تو ایمان بھی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ یہاں بات حقیقی ایمان کی ہو رہی ہے نہ کہ قانونی ایمان کی جس کی بناء پر ہم کسی کو دنیا میں مسلمان سمجھتے ہیں۔ یہ تو ہماری ایک سماجی ضرورت اور مجبوری ہے کہ ہم دنیا میں کسی شخص

کو قانونی طور پر مسلمان قرار دینے کے لئے ان ظاہری علامات ہی کا اعتبار کریں گے جو شریعت نے معین کی ہیں۔ کوئی شخص اللہ کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتا ہو اور دیگر کائنات اسلام کی پابندی کرتا ہو یا کم از کم ان میں سے کسی کا منکر نہ ہو تو اسے قانوناً مسلمان سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ ہم کسی کے دل میں جھانک کر دیکھنے پر تو قادر نہیں ہیں۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے اور ایمان کے ان دونوں درجوں کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ایک طرف یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ ایمان اور اطاعت لازم و ملزوم ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعت کے بغیر ایمان کی نفی فرمائی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی تعلق علیہ روایت میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں :

لَا يَزِينِي الزَّائِي حَيْثُ يَزِي وَيَهُ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حَيْثُ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حَيْثُ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ...

یعنی کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا، کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور کوئی شراب پینے والا حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرتے وقت ایسے شخص کا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ اس طرح کی احادیث میں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے۔ دوسری طرف اہل سنت کا تعلق علیہ موقف یہ ہے کہ ہر فاسق و فاجر کلمہ گو کو بھی قانونی طور پر مسلمان سمجھا جائے گا اور اس کے گناہگار ہونے کی بنا پر اس کے ایمان (قانونی) کی نفی نہیں کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”الفتاویٰ الکبریٰ“ میں جو فقہ کے میدان میں ان کا اصل کارنامہ ہے اور جس میں ریاست اور قانون سے متعلق بنیادی معاملات و مسائل کو طے کیا گیا ہے، یہ اصول بیان کیا ہے کہ گناہ و کبیرہ کا مرتکب بھی کافر نہیں ہے، اس کے قانونی ایمان کی نفی نہیں کی جائے گی۔ ان کا یہ اصول صدیقی صمد درست ہے۔ البتہ جیسا کہ عرض کیا گیا، حقیقی ایمان کے لئے اطاعت ناگزیر ہے۔ ایک حدیث کے مطابق، جسے امام نوویؒ نے صحیح قرار دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اصولی طور پر یہ طے فرمادیا ہے کہ

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هُوَ أَوْ تَبِعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ  
 ”تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک جو شخص نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی  
 خواہش نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔“

یعنی ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خواہش نفس میں انقیاد پیدا ہو جائے، خواہش نفس دین کے تابع  
 ہو جائے اور اپنے آپ کو اطاعت کے سانچے میں ڈھل دے۔ کھانے کی طلب پیٹ کی طبی  
 خواہش ہے، لیکن یہ وہی کچھ مانگے جو حلال ہے۔ اسی طرح جنسی تسکین ایک جبلی خواہش  
 ہے، لیکن اسے صرف اس جائز راستے سے پورا کیا جا رہا ہو جو اللہ اور اس کے رسول  
 ﷺ کی طرف سے معین کر دیا گیا ہے۔ غرضیکہ جس کسی کو جو کچھ بھی دیا جائے وہ محض  
 طبی تقاضے یا طبی محبت کے طور پر نہیں، بلکہ اللہ اور رسول کا معین کردہ حق سمجھ کر دیا  
 جائے۔ اپنے نفس کو بھی محض اس کے طبی تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ نہ دیا جائے بلکہ اللہ کا  
 معین کردہ حق سمجھ کر دیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”إِنَّ  
 لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِرَبِّكَ  
 عَلَيْكَ حَقًّا“ یعنی ”تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق  
 ہے، تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔۔۔ چنانچہ والدین، بھائی، بنوں اور بیوی بچوں  
 میں سے جس کسی کو بھی کچھ دیا جائے وہ اس کا حق سمجھ کر دیا جائے اور وہی کچھ دیا جائے جو  
 اللہ نے معین کر دیا ہے۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد  
 گرامی روایت کرتے ہیں:

مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدِ  
 اسْتَكْتَمَ الْإِيمَانَ (رواہ ابوداؤد)

”جس نے کسی سے محبت کی تو اللہ کے لئے کی، کسی سے بغض رکھا تو اللہ کے لئے  
 رکھا، کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو اللہ کے لئے روکا تو اس  
 نے اپنا ایمان عمل کر لیا۔“

ایمان اور عمل صالح کا جس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اس کی صراحت ترمذی کی اس  
 حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت مسیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی

ہیں ورنہ اس سمون کی احادیث کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ اسی بات کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کی ایک آیت ملاحظہ کیجئے :

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَّمَنْ  
كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران : ۹۷)

”اللہ کا حق ہے لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا جو کوئی بھی اس کی طرف سفر کی مقدرت رکھتا ہو۔ اور جو کفر کرے تو اللہ بے پروا ہے جہاں والوں سے۔“

یعنی جو مقدرت کے باوجود حج نہ کرے وہ اصل حقیقت کے اعتبار سے گویا کہ کفر کر رہا ہے۔

اسی طرح یہ مشہور حدیث آپ نے یقیناً ہی ہوگی :

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ

”جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔“

نماز اللہ کی طرف سے عائد کردہ ایک فریضہ ہے، جو کوئی اس کو چھوڑ رہا ہے وہ درحقیقت کفر کر رہا ہے، اگرچہ قانونی طور پر اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ حقیقی کفر اور قانونی کفر میں بھی فرق ہے جس طرح حقیقی ایمان اور قانونی ایمان میں فرق ہے۔ ان چاروں چیزوں کو گنڈم کر دینے سے بہت سے فسادات پیدا ہو جاتے ہیں اور بہت سے فتنے کھڑے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ خوارج اور معتزلہ جیسے فتنے اسی وجہ سے پیدا ہوئے۔

اب اس ”اطاعت“ کے ضمن میں چند بنیادی باتیں مزید نوٹ کر لیجئے :

۱۔ اطاعتِ رسولؐ کی اہمیت : اطاعتِ اصلاً اللہ کی اور عملاً رسولؐ کی ہے۔ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے ہے، نہ کہ ان کی ذاتی



حیثیت سے۔ اس معاملے میں بھی بڑے فرق و امتیاز کی ضرورت ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت ابھی ہمارے سامنے آجائے گی۔ سورۃ النساء کی آیت ۶۳ میں فرمایا گیا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

”اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو تمہارے لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔“

یعنی کسی رسول کی اطاعت اس کی ذاتی اطاعت نہیں ہے، بلکہ اس کی اطاعت اللہ کے رسول کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ رسول اللہ کا نمائندہ ہے جو انسانوں تک اللہ کا حکم پہنچاتا ہے۔ چونکہ انسانوں تک اللہ کا حکم براہ راست نازل نہیں ہوتا، لہذا ”أَطِيعُوا اللَّهَ“ پر عمل ”أَطِيعُوا الرَّسُولَ“ کی صورت ہی میں ہو سکتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اطاعت اصل میں اللہ ہی کی ہے اور رسول کی اطاعت بھی ذر حقیقت اللہ کی اطاعت ہے، جیسا کہ فرمایا گیا:

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء: ۸۰)

”جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے در حقیقت اللہ کی اطاعت کی۔“

اسی طرح سورۃ الشعراء میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام میں سے ایک ایک رسول کا ذکر آیا ہے اور ہر رسول کی دعوت کے ضمن میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو“ وہاں اللہ کے ساتھ لفظ اطاعت نہیں آیا، کیونکہ رسول کی اطاعت بھی حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی اطاعت ہے۔ چنانچہ وہاں پر اطاعت کو رسول کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے اور اللہ کے ساتھ صرف لفظ ”تقویٰ“ لایا گیا ہے۔

رسول ﷺ کی یہ اطاعت کس درجے مطلوب ہے اور ایمان حقیقی کے اعتبار سے

اس کا معیار کیا ہے اس کے لئے سورۃ النساء کی آیت ۶۵ ملاحظہ کیجئے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ  
نُفْمَ لَا يَبْجُذُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا  
تَسْلِيمًا ۝

”تو اے محمد ﷺ (آپ کے رب کی قسم یہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک

کہ یہ ان تمام معاملات میں جو ان کے باہمی اٹھ کھڑے ہوں آپ کو حکم تسلیم نہ کریں اور پھر وہ فیصلہ آپ کے دین اس کے بارے میں بدل میں بھی کوئی عملی محسوس نہ کریں اور اسے خوشی سے قبول کریں۔

رسول ﷺ کے حکم کو رد کرنا اور آپ اس کی نافرمانی کرنا تو بہت دور کی بات ہے جو حکم کھلا بغاوت ہے۔۔۔ لیکن طرز عمل اگر یہ ہو کہ رسول کا حکم مان بھی لیا اور اس پر عمل بھی کر لیا لیکن طبیعت میں کھن یا تقاضا ہو گا اوری اور کجی کا احساس ہو تو یہ کیفیت بھی ایمان کے منافی ہے۔ اس ضمن میں ایک بہت پیاری اور بڑی جامع حدیث صحیح بخاری میں آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”كُلُّ أُمَّتِي بَدَأَتْ خُلُوقًا فَجَسَدَتْ إِلَى كَيْفِ أُمَّتِي“

”میری امت پوری کی پوری جنت میں جائے گی سوائے اس کے جو خود انکار کرے گا“

وہ کیا؟

فصل کہ من ائمتی؟

پوچھا گیا (اے اللہ کے رسول ﷺ) ایسا کون ہے جو (جنت میں جانے سے) انکار کرے؟

قال: ”مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي لَقِيَ أُمَّتِي“

فرمایا: ”جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے گویا جنت میں جانے سے انکار کر دیا۔“

تو معلوم ہوا کہ جنت میں داخلے کا سہارا وہ رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔

۲۔ حدیث رسول کا مقام: رسول ﷺ کے حکم کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ رسول کا حکم وحی جلی پر مبنی ہو سکتا ہے اور وحی خفی پر بھی۔ وحی جلی قرآن ہے جسے وحی جلی بھی کہا جاتا ہے یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور وحی خفی حدیث رسول کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ رسول کا حکم صرف وحی شمار نہیں کیا جاتا بلکہ قرآن میں ہونگے رسول ایسا حکم بھی دے سکتے ہیں جو وحی جلی پر مبنی ہو۔ یہ نکتہ اہل سنت اور مکررین سنت کے مابین حدِ فاصل ہے۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ



حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لو ان آگاہ ہو جاؤ مجھے قرآن مجیٰ دیا گیا ہے اور اسی کی مانند ایک نور ہے بھی اور دیکھو ایسا لفظ ہو کہ کوئی پیدہ ہوا محض اپنے منہ پر کھٹ پر ایک لگے بیٹھا ہو اور لوگوں سے کہہ رہا ہو کہ دیکھو لوگو تم پر جس میں قرآن کی پابندی لازم ہے، جو کہ تم میں میں طلال ہاؤ اسی کو طلال سمجھو اور جو کہ اس میں حرام ہاؤ اسی کو حرام سمجھو۔ جان لو کہ جس طرح اللہ نے جو چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں اسی طرح اللہ کے رسول نے بھی جو چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔"

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی یہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ "انہی اونیست القرآن و مہملۃ معہ"۔۔۔۔۔ یہ الفاظ اس حقیقت پر نہیں قطعی کادر جہ رکھتے ہیں کہ وحی جلی (قرآن) کے علاوہ محمد رسول اللہ ﷺ کو ایک وحی غیبی بھی عطا ہوئی ہے اور وہ اپنی قطعیت کے اعتبار سے قرآن کے مثل ہے۔ اسی طرح "اتما حترم رسول اللہ" کہنا احترام اللہ کے الفاظ سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ حدیث طور رسول ﷺ احکام شریعت کا اپنی جگہ پر ایک مستقل ذریعہ اور مستقل شعبہ ہے۔ اس اعتبار سے رسول کی اطاعت خواہ وہ وحی جلی پر مبنی ہو یا وحی غیبی پر بہر حال لازم ہے اور اس ضمن میں ان دونوں میں تفریق نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح مسداحم، سنن ابی داؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور بیہقی میں حضرت ابو رافع سے روایت ہے:

لَا أَطِيعَنَّ أَحَدًا كَمَا عَطَىٰ أَرِيكَهٖ بِمَا يَبِيهٖ الْأُمُورُ مِنْ أَمْرِ مَتَا  
أَحْرَبْتُ بِهِ أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ: لَا أَدْرِي مَا وَجَدْنَا فِي  
كِتَابِ اللَّهِ أَتَبَعْنَا۔

"ایسا نہ ہو کہ میں پاؤں تم میں سے کسی شخص کو کہ وہ اپنی کسی آرام دہ نشست پر بیٹھا ہوا ہو اور اس کو میرا کوئی حکم پیچھے چھوڑیں گے کوئی کام کرنے کو کہنا ہو یا کسی سے دلا کا ہو تو وہ کہے: میں نہیں جانتا، ہم تو بس اسی سے کیا پھرو گی کریں گے جو کتاب اللہ میں ہے۔"

ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لاگوں کو جو رواج کیا ہے جو بڑے مرتدہ الحال اور بڑے خوشحال ہوں گے، بڑے اچھے نکلتے ہیں ایسے ہوتے ہوں گے اور وحی جلی اور وحی

خفی کے مابین تفریق کر کے حدیث رسولؐ کا استحفاف کریں گے۔ یہ طرز عمل یورپائیوں کا نہیں ہو گا بلکہ اونیسی سچ کے لوگ ہی اس کمرانی میں جھٹا ہوں گے۔

۳۔ رسولؐ کے حکم اور ایسے نکل فریق: اس ضمن میں تیسری اہم بات یہ ہے کہ رسولؐ کے بھی حکم، مشورہ اور روانے میں فرق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بہت مشکل مسئلہ ہے کہ اس فرق کا تعین کس طرح کیا جاسکے۔ مسئلہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مشکل نہیں تھا، لیکن آپؐ کے بعد اس اشکال کے حل کے لئے امت کے بہترین دماغوں نے سوچ بچا رکھی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ سمجھنا حاصل تھی کہ وہ آپؐ سے دریافت کر لیتے تھے کہ حضورؐ یہ آپؐ کا حکم ہے یا مشورہ؟ یہ بات جو آپؐ فرماتے ہیں آیا یہ اللہ کا حکم ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے یا یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے؟ آیا میں اس کے بارے میں کچھ کہنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ پھر مشورہ بذریعے موقع پر بعض صحابہ کرام نے آپؐ سے عرض کیا کہ اس جگہ جو آپؐ نے فرمایا تو لگایا ہے اگر تو یہ از روئے وحی ہے تو سمیعنا واطعنا لیکن اگر یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکیں۔ لیکن بعد کے ادوار میں اس اشکال کے حل کے لئے فقہائے کرام کو بہت محنت کرنا پڑی ہے۔

یہاں ہم حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے بعض واقعات کی روشنی میں اس مسئلہ کو مصلحتی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حدیث صحیحہ میں "جنت موعود" حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ لائے تو آپؐ آئے دیکھا کہ اہل مدینہ کجور کے ضمن میں مصنوعی ذرباشی (Artificial Pollination) کا اہتمام کرتے تھے، یعنی ذر کجور کے گامبے کو مونث کجور کے گامبے کے نزدیک بدلے آیا جاتا تاکہ ذرباشی کا عمل زیادہ ہو اور اس طرح زیادہ پھل حاصل کیا جاسکے۔ یہ چیز ان کے تجربے میں تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ عمل کرتے دیکھا تو فرمایا کہ اگر تم یہ نہ کرتے تو شاید بہتری ہوتا۔ یعنی قدرت نے جو نظام بنا رکھا ہے اس میں خواہ مخواہ کی دخل اندازی کیوں کی جائے۔ اس پر صحابہ کرام نے اس سوال مصنوعی ذرباشی نسل کا کیا عمل نہیں کیا لیکن اس کے نتیجے میں فصل کم ہو گئی۔ چنانچہ صحابہ کرام آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضورؐ ہم اپنے تجربے

کی جگہ یہ عمل کیا کرتے تھے مگر اس بار آپ کے فرمانے سے ہم نے ایسا نہیں کیا، لیکن اس سے فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ حَرْمَةِ اللَّهِ فَتَعْذَرُوا بِهِ وَوَلَدًا

أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِ رَبِّي فَاتَّقُوا اللَّهَ

”بلاشبہ میں ایک انسان ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی

حکم دوں تو اسے مضبوطی سے تھامو اور اگر تم سے میں کوئی بات اپنی رائے کی

بتاؤ پر کہوں تو میں بھی ایک انسان ہوں۔“

یہ صحیح مسلم کی حدیث ہے جو حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ حدیث اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس سے دینی معاملات اور سائنسی ترقی سے متعلق معاملات کی نوعیت میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔ نئی سائنس پڑھانے آئے تھے نہ ذراعت کے طوبہ طریقے سکھانے، بلکہ ان کا اصل موضوع انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانوں کی نظری اور عملی ہدایت تھا۔ چنانچہ جو چیز آپ کی طرف سے اس ضمن میں دی جائے اس کو لے لینا اور مضبوطی سے تھامنا لازم ہے، لیکن جن معاملات کا تعلق امور دینیہ سے نہیں بلکہ امور بیعیہ سے ہے ان کے ضمن میں نبی اگر اپنی ذاتی رائے پیش کریں تو اس کا تسلیم کرنا بھی واجب نہیں، کجا یہ کہ اس پر عمل کرنا واجب ہو۔ مثلاً یہ کہ بارش کیسے ہوتی ہے؟ زلزلے کیسے آتے ہیں؟ دن اور رات کیسے نکلتے ہیں؟ سورج اور چاند کا کیا نظام ہے؟ ظاہریات ہے کہ ان چیزوں کا تعلق امور تکوینیہ اور امور بیعیہ سے ہے، نہ کہ امور دینیہ اور امور تشریحیہ سے۔ ایسے امور کی جو توجیہ بھی رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد میں فرمائی وہ اُس وقت کی علمی سطح کے مطابق تھی اور اُس وقت اس سے زیادہ کوئی بات بتانا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ انسانی ذہن ابھی اس سطح پر نہیں پہنچا تھا کہ ان حقائق کا ادراک کر سکا۔ اس کے لئے تو اگر پہلے فزکس، کیمسٹری، حیالوجی اور اسٹراٹوجی جیسے علوم پڑھائے جاتے تب کہیں جا کر وہ چیزیں لوگوں کے ذہن کی گرفت میں آئیں جو سائنسی ترقی کی وجہ سے آج ہمارے علم میں ہیں۔ اور اللہ کے رسول اُس کے لئے نہیں بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ حضور نے اُس دور کی علمی سطح کے مطابق لوگوں کو سمجھانے کے لئے ان معاملات سے



اگر یہ واقعہ احادیث میں نہ آیا ہوتا تو شاید ہم میں سے کسی نے ان کا نام بھی نہ سنا ہوتا کہ حضرت عائشہؓ کی کوئی برہہ نامی کنیز بھی تھی۔ لیکن یہ واقعہ ایسا ہے اور اس میں مسلمانوں کے لئے ایسی اہم ریاضت ہے کہ اب اس کے حوالے سے حضرت برہہؓ کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

طاعت کے مہمن میں نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ طاعتِ املا اللہ کی ہے لیکن ملامتِ رسولؐ کی ہے۔ پھر یہ کہ اللہ کے رسولؐ کی یہ طاعت ہر حکم میں واجب ہے، وہ حکم وحی جلی پر جلی بھی ہو سکتا ہے اور وحی خفی پر بھی۔ البتہ رسولؐ کے حکم اور ان کے مشورے اور رائے میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا ہو گا۔

## ”اولی الامر“ کی اطاعت

حکم ہر اولی الامر کے حکم میں ایک اہم واقعہ ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد ”اولی الامر“ کی اطاعت کا حکم ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ میں فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ يَا أَيُّهَا  
الْأُمَرَاءُ مِنْكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ  
وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤَيِّنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ایمان امر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر باہم جھگڑو کسی چیز میں تو اس کو لوٹا دو اللہ اور رسولؐ کی طرف اگر یقین رکھو ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔“

یہ آیت مبارکہ اس اعتبار سے قرآن حکیم کی اہم ترین آیات میں شمار ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر جو دستوری اور قانونی نظام قائم کیا جائے گا اس کے لئے راہنمائی کا یہ گویا سب سے بڑا معجزانہ اور منبع و سرچشمہ ہے۔ اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت کے بارے میں تو ہم گفتگو کر چکے ہیں، یہاں اب اولی الامر کی اطاعت کے معاملے کو تھوڑا سا تجزیہ کر کے سمجھ لیا جائے۔





کے رسول ﷺ کی اطاعت سے متصادم ہو: ”لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق“۔

مذہبِ آلِ بائعہ کے امام کا شمار بھی اولی الامم میں ہوتا ہے۔ ایسے امام رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی ہوتے تھے، جیسے کہیں کوئی لشکر بھیجا جاتا تو اس کا کسی کو سپہ سالار مقرر کیا جاتا، کہیں کوئی چھوٹا سارے بھی بھیجا جاتا تو اس میں بھی کسی کو امیر بنا دیا جاتا۔ اس ضمن میں نہیں چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دو واقعات آپ کے سامنے آ جائیں۔ فرزہ احد میں ۳۵ حضرات کی طرف سے اپنے امیر حضرت جبریل بن مطعم کی حکم عدولی کا نشانہ بن کر مشہور ہے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ نے پچاس تیرا اندازوں کا امیر مقرر کر کے ایک قندسے ہتھکین کیا تھا اور ان حضرات کو حکم دیا تھا کہ آپ لوگ اس در سے کویت چھوڑیں خواہ میں کھست ہوا جائے، ہم سب گل ہو جائیں اور آپ لوگ دیکھیں کہ پرندے ہلکا گوشہ فرج کوچ کر رہے ہیں۔ ان حضرات نے جب اپنے لشکر کوچ سے ہٹکار دھرتے اور دشمن کو راز افرا اختیار کرتے دیکھا تو درے کو چھوڑ کر جانے لگے، کیونکہ ان کے خیال میں حضور ﷺ نے درے کو نہ چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ کھست کی صورت میں تھا۔ لوکل کمانڈر حضرت جبریل بن مطعم انہیں روکتے رہے، لیکن ان ۵۰ میں سے ۳۵ صحابہ کرام درے کو چھوڑ گئے۔ ماتحت امیر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوری طور پر یہ دی گئی کہ جیتی ہوئی جنگ کا نشانہ بننے لگا۔ نور کا آل عمران میں اس کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَا لَكُمُ الْيَوْمَ وَالْغَدَ وَذُرِّيَّتِكُمْ أَنْ لَا تَقُولُوا بِاللَّهِ حَتَّىٰ إِذَا قِيلَ لَكُمُ اسْكُوبُوا فَيَقُولُوا اسْكُوبُوا وَمَا آرَآكُم مَّا

یعنی اللہ نے تو ہمیں اپنا وعدہ چ کر دکھایا تھا جب تم انہیں گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم ڈھیلے پڑے، تم نے حکم کو توڑا اور تم نے نافرمانی کی بعد اس کے کہ میں تم کو وہ چیز دکھاؤں گا جو تمہیں بہت محبوب ہے، یعنی حج۔۔۔۔۔ یہاں نافرمانی سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہیں، بلکہ ماتحت کمانڈر کی نافرمانی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ

کے حکم کی دوا میں نے تاویل کر لی تھی۔

اسی طرح کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کا ایک دستہ کہیں بھیجا اور ان میں سے ایک صاحب کو ہنس کا امیر مقرر کیا۔ یہ صاحب ذرا اجماع مزاج کے مالک تھے کسی بات پر اپنے ساتھیوں سے ناراض ہونے اور یہ ہنر اسکی اس حد تک کہلی کہ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو ایک مدت بڑھانے کا حکم دیا۔ جب انھوں نے کڑھا کھوڑا تو ان سے فرمایا کہ اس کے اندر کھویاں میں بھریں اور اس کو کھریں تو اس میں کھل جائے گا حکم دیا۔ جب آگ بھڑک اٹھی تو ساتھیوں سے فرمایا کہ اب اس آگ کے آگے اور گورہاؤ اس پر ساتھیوں نے کہا کہ اس آگ کے آگے تو ہم نے کھریں اور اس میں کھل جائے گا ہم اس میں داخل ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ جب دہلیں کھلیں تو اس آگ کے آگے پہنچ گیا اور حضورؐ نے ان کی تہذیب کی اور فرمایا کہ اگر یہ آگ میں کھل جائے تو ہم اس آگ میں کود پڑے تو بیچہ آگ ہی میں رہے۔ اس لئے حضورؐ نے اس کی سرانجام دہی لگا کر ہے۔ چنانچہ اہل بیتؑ امراء کی امانت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں آئی اور رسول کے حکم کے تابع تھے اس واسطے کہ ان کے لئے عذاب ہو گا۔ اور رسولؐ کی امانت کے ساتھ یہ شرط ہے کہ

صحابہ کرامؓ کا عظیم کارنامہ

رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ معاملہ اس اعتبار سے بحث کھنجن میں گیا ہے کہ اب قرآن مجید ہمارے سامنے صرف ایک کھنجن کی صورت میں موجود ہے، اللہ ہمارے سامنے نہیں نہیں نہیں ہے وہ نہ ہمیں براہ راست حکم دے رہا ہے اور نہ براہ راست اپنے حکم کی تاویل و توجیح کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے میں اللہ کے احکام کی تاویل بھی فرماتے اور اس کی توجیح بھی فرماتے جو ہر لحاظ سے مستحسب تھی۔ انہیں اس کا اختیار حاصل تھا۔ اسی طرح حضورؐ خود اپنے حکم کے بارے میں بھی وضاحت فرماتے تھے کہ میری اس بات کی حیثیت واجب التحمل حکم کی ہے اور میری یہ بات صرف مشورے کے درجے میں ہے۔ چنانچہ معاملہ بہت سادہ تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ کھنجن کرنا آسان نہیں رہا کہ



میں تحقیق و تفتیش کے بعد ان پر جو برس ہو تھے ان کی اس پر آج میں اٹھو کر لیا ہو گا۔ ہمارا یہ علمی بورڈ جس کا اس قدر وسیع و عریض ہونا غلامانہ خیال سمجھنا ہے یہ بے بنیاد نہیں ہے اس کی پشت پر کوئی خواہ مخواہ کی سوشلسٹی کا پرزہ یا شوق کارفرما نہیں تھا یہ سب کچھ محض پیشلے کے طوڑ پر نہیں کیا گیا بلکہ یہ نوزین کی ایک نیا انکم فیڈرٹی اور واقعی ضرورت تھی جس کو ان ائمہ دین نے پورا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان ائمہ کو مجھڑوں میں شمار کیا گیا ہے۔

### اطاعت کی دو عملی صورتیں

روایہ سوال کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اطاعت کا یہ نظام عملاً کیسے چلے گا تو عملی طور پر اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اگر تو انتظامی نظام حکومت قائم ہے تو اس کا والی امرائے آپ خلیفہ کہیں یا سلطان یا اس کی اطاعت لازم ہے۔ اس اطاعت کے ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیفہ کی اچھولتے میں بھی تو ظلمی ہو سکتی ہے بلکہ یہ کون سے کئے گا کہ خلیفہ کی برائتہ درست ہے یا نہیں؟ بلوچہ التامری آیت اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ "اولی الامر منکم" اور اولی الامر کی اطاعت کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر توجہ دینا چاہئے کہ "مَنْ أَتَى مَنَازِلَ عَشْرَمِ رَمَى شَيْئًا فَرَدَّ قُوَّةَ الْمَنِيِّ إِلَى الْوَالِدِ الرَّحْمَلِ" اگر کسی معاملے میں تمہارے مابین کاظم ہو جائے تو اس معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف لاؤ، لیکن عملاً اس کا نظام کیا ہو گا؟ والی امر اگر اپنی کسی جگہ کے پڑھو میں کہ وہاں کہ یہ چیز شریعت کے دائرے کے اندر ہے، لیکن کوئی صاحب علم یہ کہے کہ میں اس سے شریعت کا قائلان حکم ٹوٹ رہا ہے تو اس کے پھیلے کے لئے کوئی اور اور کوئی ایسی نیشن ہو نا چاہئے جسے عمر حاضر میں خلافت کا نظام جب بھی قائم ہو گا اس میں اہم ترین مسئلہ یہی ہو گا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کون کرے؟ اول تو یہ کہ اولی الامر کیسے وجود میں آئیں؟ قرآن مجید نے ہمیں اس کا کوئی نظام نہیں دیا اور اس معاملے کو کھلا رکھا ہے، اس لئے کہ نزول قرآن کے وقت معاشرتی ارتقاء (Social Evolution) کا عمل بھی ابھی چل رہی تھا اور اس میں انسان کو ابھی درجہ بدرجہ ترقی کرنا تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ منتقل ہو چکا۔ اب کوئی والی امرئی نہیں ہو گا۔ لہذا معلوم نہیں ہو گا کہ ایسے مسلمانوں میں سے ہو گا اور اس کا تقرر

”عن مشورۃ المسلمین“ (مسلمانوں کے باہمی مشورے سے) عمل میں آئے گا۔ اس کے بعد اب یہ سوال پیدا ہو گا کہ اگر صاحب امر ایک بات کے اور کچھ اہل علم یہ محسوس کریں کہ یہ از روئے قرآن و حدیث غلط ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ معاشرتی ارتقاء کا عمل آج جس مقام تک پہنچا ہے اس میں ریاست کے تین بنیادی اعضاء (Basic Organs) یعنی کئے گئے ہیں، یعنی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ۔ اور یہ فرض منجھی عدلیہ یعنی اعلیٰ عدالتوں (Higher Judiciary) کے ذمے عائد ہو گا کہ وہ اس معاملے کو طے کریں۔ خطا کا امکان اگر چہ وہاں بھی ہے، لیکن بہر حال صاحب امر (خلیفہ) اور دستور ساز اسمبلی، جسے مجلس ملی، مجلس شوریٰ، مجلس مقننہ، مجلس اجتہاد، کانگریس یا پارلیمنٹ، جو نام بھی دیا جائے، ان دونوں کے مابین بھی اگر نزاع پیدا ہو جائے تو اسے عدلیہ ہی کو طے کرنا ہو گا۔ اسی طرح قوم کا کوئی فرد اگر یہ سمجھتا ہے کہ مجلس ملی یا مجلس شوریٰ نے یہ جو فیصلہ کیا ہے یہ شریعت کے منافی ہے، یا وہ خلیفہ کے کسی فیصلے کے خلاف استفسار کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی عدلیہ ہی سے رجوع کرے گا۔

عملی اعتبار سے دوسری صورت یہ ہے کہ دین کا نظام ہی قائم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اسے قائم کرنے کی جدوجہد اور محنت کرنا ہوگی، اس کے لئے جہاد کرنا ہوگا اور اس جدوجہد کے لئے جماعتیں بنانا ہوگی، جہاد کا جو امیر ہو گا اس کی حیثیت اولی الامر کی ہوگی۔ اب اس صورت میں بھی جماعت کے اندر کوئی تنازعہ اٹھ سکتا ہے، کسی کو امیر جماعت کی کسی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ یہ اختلاف اگر اس درجے میں ہو کہ بس رائے کا اختلاف ہے تو بات اور ہے، اختلاف رائے سے علی الرغم امیر کا حکم ماننا پڑے گا لیکن اختلاف کی نوعیت اگر یہ ہو کہ کوئی سمجھے کہ جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے وہ بات شریعت کی رو سے جائز نہیں ہے، اس میں حدود شریعت سے تجاوز ہو گیا ہے تو اس صورت میں ظاہرات ہیں کہ آخری فیصلہ اس شخص کا اپنا نہیں ہری کرے گا۔ یہاں کوئی عدالت فیصلہ نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ ایک جماعتی معاملہ ہے۔ جماعت کی اپنی کوئی علاقائی حدود (Territorial Jurisdiction) نہیں ہیں، کسی علاقے پر اس کا حکم نہیں چل سکتا ہے، چنانچہ اس کے اندر کسی عدلیہ کا معاملہ نہیں ہو گا بلکہ اختلاف کرنے والے شخص کا اپنا فیصلہ

ہی حقی ہو گا جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: **مَنْ اسْتَعْتَبَ قَلْبَكَ وَلَتَوَافَاكَ الشُّغْبَىٰ** کہ اچھے دل سے ٹھوکی گئے لیا کرو اگرچہ تمہیں ملتی فتویٰ دے بھی دیں۔  
 کو یا اصل ملتی تمہارا لبت ہے۔ **قلب کا تعلق اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔** اگر تمہارا ضمیر  
 مطمئن ہے کہ تم نے اس وجہ سے ایسا کا فیصلہ خلیع میں کیا یا جماعت ہی سے علیحدگی اختیار کر  
 لی کہ تمہارے نزدیک صاحبِ امر (امیر) نے شریعت ہی سے دور سے تجاوز کیا ہے تو اللہ کے  
 ساتھ تمہارا معاملہ صاف رہے گا۔ اور اگر اصل سبب کچھ اور ہے، کوئی تکبر، حسد، طبیعت  
 کا کوئی نظر زباؤں کی پیر کی بن گیا ہے، یا رانے کی جھپٹیاں ساتھ دینے میں آؤ گے، اگر ہی ہیں  
 آگے چلنے کی ہمت نہیں ہے اور صرف بلا بلا بنا جا رہا ہے تو یہ اللہ کے علم لئے باہر نہیں اس  
 کے ہاں اس پر پھر ہوگی اور انسان کو اللہ کی بڑائی ہی کرنا ہو گا۔ لیکن وہاں ظاہرات ہے کہ  
 اس کا فیصلہ کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکا۔ یہ بڑے اور رب کے نامین راز رہے گا۔ یہ  
 چند باتیں تھیں جو اس آئیہ مبارک کے ذیل میں ہمارے سامنے آئیں: **وَاطِيعُوا اللَّهَ**  
**وَاطِيعُوا الرَّسُولَ** فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا تَحْتَلِي وَشَوْلَانَا إِلَهُكُمُ  
 الْمُبِينُ ۝

### دین مکن "مطاعت" کا مقام

اس ضمن میں اب ہم اس سورہ مبارکہ کی آیت ۱۱ کا مطالعہ کرتے ہیں:

**فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَكْمَلْتُمْ وَاسْمِعُوا وَأَطِيعُوا وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذَلِيلِكُمْ** وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ مَا لَقِيَكَ مِنْ  
 الْمُؤْمِنِينَ ۝ (التھاب: ۱۱)

”ہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی اعمال تکمیل اور سنو اور اطاعت کرو اور فرج  
 کرو اپنے عمل کے لئے۔ اور جو کوئی چھوڑا گیا اللہ ہی کے لالچ سے تو یہی لوگ لالچ  
 پانے والے ہیں۔“

سورہ التھابین کے دو سرے دکن کی آیت ۱۱ (۱۱: ۱۱) کے بارے میں یہ بات  
 بیان ہو چکی ہے کہ ان میں شراہ ایمانی لوگوں آتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا تعلق کرو

نظری کی تبدیلی سے ہے، جبکہ سورت ایک سے بعد عمل سے متعلق ہے، جس پر ہم نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۶ سے زور دار دعوت عمل دی جا رہی ہے۔ صرف ایک لفظ ”فَاتَّقُوا اللّٰهَ“ میں ہم کہہ چکے ہیں کہ امان باللہ اور امان بالآخرۃ دونوں کو سمویا گیا ہے اور اس کے بعد سارا زور دعوت عمل اور امن میں بھی خاص طور پر اطاعت پر ہے۔ چنانچہ اس کے ضمن میں فرمایا گیا: ”وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا“ (سواد اور اطاعت کرو) اطاعت کے ضمن میں اگرچہ اس سے پہلے پوری ایک آیت گزر چکی ہے، جس پر ہم تفصیل گفتگو کر چکے ہیں، لیکن اس آپ مبارکہ میں بھی ”وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا“ کے الفاظ میں اطاعت کی زور دار دعوت ہے۔ ان الفاظ کے حوالے سے چار بائیں ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں:

### قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح

پہلی بات یہ کہ ”سبع و اطاعت“ قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آیت زبور درج کے علاوہ چار مقامات پر یہ جوڑا ہی طرح آیا ہے:

(۱) سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات کے بارے میں روایت ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے شبہ سراج میں عطا ہوئی ہیں۔ سورۃ البقرہ اگرچہ پوری ایک پوری معنی سورت ہے، لیکن اس کی آخری دو آیات اس اعتبار سے کمی شمار ہوں گی کہ واقعہ سراج کی دور میں پیش آیا جن کے دوران مسند کے لئے چٹان کے طور پر یہ دو آیتیں دی گئیں۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۲۸۵) جس کا آغاز ”أَمَّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا“ کے الفاظ سے ہوتا ہے، کے آخری الفاظ ہیں:

وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا فَخُفِرْنَا كَذَّبْنَا وَإِنَّا كَفُورٌ

”اور وہ کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کیا، ہم نے کفر سے ہٹ چکے ہیں اور ہم نے اپنے

ہمارے رب اور ہماری ہی طرف سے سنا لیا ہے۔“

سورۃ البقرہ کے بارے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ شریعت اسلامی کا آغاز





”اور کافر (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ اس قرآن کو مت سنا اور (جب محمدؐ سے پڑھ کر سنا رہے ہوں تو) اس میں شور و غل کرو، شاید کہ (اس تدبیر سے) تم غالب ہو جاؤ!“

اس صورت میں تو ”سمع“ ہی کی نفی ہو گئی، جبکہ ایک طرز عمل وہ تھا جو یہود نے اختیار کر رکھا تھا اور جس کا ذکر قرآن حکیم میں دو بار ”سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا“ کے الفاظ میں آیا ہے، یعنی ”ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی“۔ یہود کے یہ الفاظ سورۃ البقرہ کی آیت ۹۳ میں بھی نقل ہوئے ہیں اور سورۃ النساء کی آیت ۴۶ میں بھی۔ مؤخر الذکر آیت کا دوسرا ٹکڑا اوپر بیان ہوا ہے۔ آیت کے پہلے حصے میں یہود کا طرز عمل بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں کہ یہ کہتے ہیں ”سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا“ حالانکہ انہیں کتنا چاہئے تھا ”سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا“۔ تو ”سمع و طاعت“ درحقیقت قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔

### ”سمع و طاعت“ کا ایک اہم تقاضا۔۔۔ فوری تعمیل

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ اس اصطلاح اور اس اسلوب سے پیش نظر کیا ہے! ”وَأَسْمَعُوا وَأَطِيعُوا“ (سنو اور اطاعت کرو!) کے الفاظ میں درحقیقت فوری (immediate) اطاعت کا حکم ہے، یعنی سنتے ہی اطاعت کا لازم ہو جانا۔ ایک درمیانی طرز عمل یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات سن تو لی جائے، لیکن اگر اپنی سمجھ میں آئے تو مان لی جائے ورنہ رد کر دی جائے، اس طرح ”سننے“ اور ”ماننے“ کے درمیان ”اپنی سمجھ“ حائل ہو جاتی ہے۔ اس طرز عمل کا تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گویا آپ اس حکم کو نہیں مان رہے بلکہ اپنی سمجھ کی اطاعت کر رہے ہیں، کیونکہ آپ نے صرف اس حکم کو مانا ہے جو آپ کی سمجھ میں آیا۔ گویا اصل مطاع تو آپ کی سمجھ ہوئی۔ یہ اسی طرح کا طرز عمل ہے جیسا کہ اگر اللہ کا کوئی حکم آپ کے نفس کو بھی پسند آیا اور آپ اس پر عمل پیرا ہو گئے تو آپ نے اطاعت اللہ کی نہیں بلکہ اپنے نفس کی کی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت تو بلا استثناء ہوتی چاہئے، خواہ سمجھ میں آئے خواہ نہ آئے۔ تو ”وَأَسْمَعُوا وَأَطِيعُوا“ ایک ایسا اسلوب ہے جس میں فی الفور

اطاعت کا تقاضا ہے، یعنی سنتے ہی اس پر عمل کرو۔ اپنی سمجھ میں آنے یا نہ آنے کا سوال ہی درمیان سے نکل جانا چاہئے۔ میٹرک کے زمانے میں ہم نے ایک نظم اور حملے کی صورت میں ان چھ سوسواروں کی ہلاکت یقینی تھی۔۔۔ لیکن

Theirs not to make reply.

Theirs not to reason why.

Theirs but to do and die!

ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اس وقت اس حکم کی حکمت دریافت کریں اور اپنے دلائل پیش کریں کہ یہ حکم غلط دیا گیا ہے، بلکہ آرمی ڈسپلن اس طرز عمل کا نام ہے کہ جو حکم دیا گیا ہے اس کی فوری تعمیل کرو اور اس میں موت آتی ہے تو آئے اتویہ ہے درحقیقت وہ طرز عمل کہ جو ”وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا“ کے جواب میں مطلوب ہے۔

### سمع، طاعت پر مقدم کیوں؟

اس سلسلے میں تیسری لائق توجہ بات یہ ہے کہ ”سمع و طاعت“ میں ”سمع“ مقدم ہے ”طاعت“ پر۔ ویسے تو طبعی ضابطہ بھی یہی ہے کہ آپ کوئی بات سنیں گے تو اس کی اطاعت کریں گے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ”سمع و طاعت“ کا حکم دیتے ہوئے ”وَاسْمَعُوا“ کو کیوں نمایاں کیا گیا ہے؟ اس لئے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد ایک اجتماعی شکل اور جماعتی ہیئت ہی میں ممکن ہے اور اس سلسلے کے تمام احکام سے بروقت آگاہی کے

لئے اس جماعتی نظم سے وابستگی اور پیوستگی ضروری ہے۔ اگر آپ اس جماعتی نظم سے وابستہ نہیں ہیں تو ”سبح“ ہی نہیں ہوگا، نتیجتاً ”طاعت“ کی نوبت کہاں آئے گی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام خطبات جمعہ میں صادر ہوتے تھے۔ اُس وقت آج کی طرح ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات، ٹیلی فون اور ٹیلی گرام جیسے رسل و رسائل اور ابلاغ کے ذرائع تو تھے نہیں۔ اب جو شخص جمعہ میں آتا ہی نہ ہو اور اس طرح ان احکام کے سننے ہی سے محروم رہے تو وہ اطاعت کیسے کرے گا! چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ جمعہ کے دوران منبر پر یہ فرمایا کہ یہ لوگ جو جمعہ میں شرکت سے رہ جاتے ہیں وہ اس طرز عمل سے باز آجائیں، ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا۔ یعنی

”خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ“

کے الفاظ میں بدترین کافروں کے لئے جو سزا سنائی گئی ہے انہیں وہ سزا ملے گی۔

اسی طریقے سے کوئی انقلابی جماعت جو اسی مقصد (غلبہ دین) کے حصول کے لئے کوشاں ہے اگر آپ اس سے پیوست نہیں ہیں، اس سے چمٹے ہوئے نہیں ہیں، اس کے نظم کے ساتھ آپ کی وابستگی ہی نہیں ہے تو انقلابی جدوجہد سے متعلق احکام و ہدایات آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ہر کارے اور پیادے احکام لئے لئے پھر رہے ہوں اور ایک ایک شخص کو تلاش کر کے ان کی قبیل کرائیں۔ عدالتی نظام میں اور حکومتی سطح پر تو ایسا ہوتا ہے کہ گھروں پر جا کر سمن کی قبیل کرائی جاتی ہے لیکن کسی انقلابی جماعتی نظام میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے تو ”بیوستہ رہ شجر سے امید بار رکھ“ کے مصداق جماعت سے وابستہ رہنا ضروری ہے۔ ایک پتہ جب تک درخت پر لگا ہوا ہے اسی وقت تک وہ اس درخت کا حصہ ہے۔ درخت کی جڑ سے لے کر اس کی چوٹی کے پتوں تک کے مابین ایک رابطہ قائم ہے۔ جڑ کے ذریعے سے جو پانی اور غذا درخت حاصل کرتا ہے وہ اس کے آخری پتے تک بھی پہنچ جاتی ہے، لیکن جب کوئی پتہ درخت سے کٹ جاتا ہے تو اب درخت کی غذا اسے اسے کوئی حصہ نہیں ملتا اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر جماعت سے آپ کا تعلق منقطع ہو گیا تو ظاہر بات ہے کہ اب آپ اس کے نظم اور رسلک میں نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسی پتنگ کی مانند ہیں جس کی ڈور کٹ چکی ہے اور ایک ایسے

پتے کی طرح ہیں جو اپنے درخت سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ اسی کو پیوستگی کہا جاتا ہے اور اسی کے لئے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں منسلک ہونا، یعنی پرویا جانا۔ ہاں میں اگر موتی پروئے گئے ہیں تو وہ ہار ہے، اور اگر اس کی ڈور ٹوٹ گئی ہے تو وہ ہار نہیں رہا بلکہ منتشر موتی ہیں۔ اسی طرح جماعت کے افراد اگر اس کے ساتھ منسلک اور ملتزم ہیں تو وہ صحیح معنوں میں جماعت ہے۔ التزام کے معنی چمٹ جانا ہیں اور ملتزم وہ ہے جو جماعت کے ساتھ چمٹا رہے۔ یہی درحقیقت صحیح کو مقدم رکھنے کا سبب ہے، ورنہ اس کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ یہ بات تو بالکل ظاہر اور understood ہے کہ اطاعت کا مرحلہ آتا ہی سننے کے بعد ہے۔

### صحیح و طاعت کلازمی تقاضا۔۔ بیعت

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ اس صحیح و طاعت کو نبی اکرم ﷺ نے بیعت کی شکل دی ہے۔ حضور ﷺ اگرچہ رسول تھے اور جو کوئی بھی آپؐ پر ایمان لے آتا اس پر ایمان بالرسالت کے لازمی تقاضے کے طور پر، آپؐ کی اطاعت فرض تھی۔ اس کے باوجود نظم جماعت میں اس صحیح و طاعت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے باقاعدہ بیعت لی۔ اس سلسلہ میں دو حدیثیں ملاحظہ ہوں :

۱۔ عَنِ الْحَارِثِ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : أَمْرُكُمْ بِخُمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْمَحْرُوقِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (مكتبة الصالح، بحوالہ سنن احمد و جامع الترمذی)

حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

” (مسلمانوں) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں : جماعت کا حکم، سننے کا حکم، اطاعت کا حکم، ہجرت کا حکم اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حکم۔“

اس حدیث میں حضور ﷺ نے سب سے پہلا حکم التزام جماعت کا دیا ہے۔ جماعتی نظم کی دوسری صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی اگر تو اسلامی نظام حکومت قائم ہو تو خلیفۃ المسلمین کے ساتھ صحیح و طاعت کا تعلق ہو گا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس نظام حکومت کو قائم کرنے

کی جدوجہد کے لئے جو جماعتی نظام قائم ہو گا اس کے امیر کے ساتھ وہی تعلق سب و طاعت ہو گا۔ اس کے بعد دو سر احکم سب یعنی سنے کا اور تیسرا طاعت کا دیا گیا۔ چوتھی اور پانچویں چیزیں ہجرت اور جمادنی سمیل اللہ ہیں۔ ہجرت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اَتَى الْمُهَجَّرَ وَافْضَلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ "اے اللہ کے رسول، سب سے افضل ہجرت کونسی ہے؟" فرمایا: "أَنْ تَهَجَّرَ مَا كَرِهَ رَيْثُكَ" "کہ تم ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے رب کو پسند نہیں ہے" "یہ ہے ہجرت۔۔۔ اور نیت یہ رہے کہ اگر اللہ کے دین کا تقاضا ہو تو انسان اپنا گھریا، اہل و عیال اور مال و منال سب کچھ اس کی خاطر چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ لیکن پہلا قدم یہی ہے کہ جو چیز اللہ کو پسند نہیں ہے، جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اس کو چھوڑ دیا جائے، اس سے ترک تعلق کر لیا جائے۔ اسی طرح "وَنَحْلَعُ وَنَسْرُكُ مَنْ يَفْجُرُكَ" کے مصداق ترک تعلق کی یہ قیمتی علاقین دنیوی میں بھی چل جانی چاہئے کہ فساق و فجار کے ساتھ آپ کی دوستی اور محبت قلبی کا تعلق منقطع ہو جائے۔۔۔ اور جمادنی سمیل اللہ اس کا مثبت پہلو ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں محنت، جدوجہد، ایثار و قربانی، انفاق اور قتال، یہ سب جمادنی سمیل اللہ ہی کے مدارج و مراتب ہیں۔ لیکن بہر حال نیت میں یہ چیز لازمی طور پر شامل رہنی چاہئے کہ وہ وقت آئے کہ میں اللہ کے دین کی سر بلندی کے لئے جان کی بازی لگا دوں اور اس راہ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے سرخرو ہو جاؤں، میری گردن اللہ کی راہ میں کٹ جائے۔ اگر کسی کے دل میں یہ نیت بھی موجود نہیں تو حدیث نبویؐ کی رو سے ایسا شخص حالتِ ففاق میں مرتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَنْفِرْ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِمَنْفَعَتِهِ مَاتَ عَلَى شِعْبَةٍ  
مَنْ الْيَتِيفِاقِ (صحیح مسلم، عن ابی ہریرہ)

"جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ ہی دل میں اس کی آرزو رکھی تو اس کی موت ایک طرح کے ففاق پر ہوئی۔"

## ہمارے تصور دین کی کوتاہی

حضرت حارث اشعریؒ والی حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے اس وقت کے تصور دین کا جائزہ لیجئے تو آپ کو بہت فرق و تفاوت نظر آئے گا۔ ہمارے تصور دین میں تو یہ چیزیں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ہمارے تصور دین میں وہ پانچ چیزیں تو ہیں جنہیں ایک دوسری حدیث میں ارکانِ اسلام فرمایا گیا ہے، یعنی کلمہ شہادت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔۔۔۔۔ لیکن ان پانچ چیزوں کا ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ اس حدیث کے الفاظ ہیں :

بِسْمِ الْاِسْلَامِ عَلٰی حَمِيْسٍ : شَهَادَةٌ اِنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ رَاَقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيتَاءُ الزَّكٰوةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ (متفق علیہ، عن عبد اللہ بن عمر)

”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے : گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کاج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔“

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے پانچ ارکانِ اسلام بیان فرمائے ہیں جو ہر مسلمان کو یاد ہیں لیکن دوسری پانچ چیزوں کا حکم بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے دیا ہے، تو ان سے بے اعتنائی چه معنی دار دالکہ ایک روایت میں الفاظ ہیں :

اِنِّیْ اَمْرُکُمْ بِحَمِيْسٍ : اللّٰهُ اَمْرُنِیْ بِهِنَّ ...

”میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں، اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔“

”اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ“ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو بھی لازم سمجھا جائے۔

## صحابہ کرامؓ کی بیعت کے الفاظ اور ان کی تشریح

اس ”سمع و طاعت“ کے لئے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے جو بیعت کی وہ اس حدیث میں مذکور ہے :

عن عبادۃ بن الصّامت رضی اللّٰہ عنہ قال : بَايَعْنَا رَسُوْلَ





ہے، لیکن اگر وہ معصیت کا حکم نہیں دے رہا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی صریح حکم کے خلاف حکم نہیں دے رہا، تو اگرچہ یہ حکم آپ کی رائے کے خلاف ہو لیکن آپ کو ماننا ہوگا۔ اس میں ظاہر ہے کہ آپ کو اپنی رائے کو دہانا ہوگا، اپنے نفس کو گھوٹنا ہوگا، لیکن اطاعت بہر حال لازم ہوگی۔ سو م یہ کہ ”وَعَلَىٰ آثَرِهِ عَلَيْنَا“ یعنی ”اور چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے“۔ جماعتی حکام میں یہ مرحلہ لازماً آجاتا ہے۔ کسی شخص کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے، جو سو سو بھی ہو سکتا ہے اور کسی کی واقعی رائے بھی ہو سکتی ہے، کہ میں اس منصب کا زیادہ اہل ہوں، میرے اندر اس کی صلاحیت زیادہ ہے۔ یا یہ کہ میری Standing بہت ہے، میں بہت عرصے سے جماعت کے اندر ہوں، لیکن ایک شخص جو بالکل نو وارد تھا اسے امیر بنا دیا گیا ہے۔ ایسے معاملات رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں بھی پیش آئے ہیں۔ غزوہ موہ کے موقع پر جب حضورؐ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنا دیا تو کئی لوگوں نے اعتراضات کئے اور کہا گیا کہ جعفر طیار مجھے لوگ ایک آزاد کردہ غلام کی کمان میں دیئے جا رہے ہیں۔ حضرت جعفر واقعاً بڑے جلیل القدر صحابی تھے، حضورؐ کے پچازاد بھائی اور حضرت علیؑ کے بڑے بھائی تھے۔ پھر حضورؐ نے اپنے مرضِ وفات میں حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو امیر بنایا تو اس پر بھی اعتراضات ہوئے۔ اور اپنے مرضِ وفات کے اندر آپؐ نے بڑے غصے سے یہ الفاظ ادا فرمائے تھے کہ اگر آج تم لوگ اسامہ کی امارت پر اعتراض کر رہے ہو تو تم نے اس کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا۔

انسانی معاملات میں یہ ساری چیزیں پیش آسکتی ہیں، صحیحہ گمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لہذا حضورؐ نے جب بیعت لی تو ”وَعَلَىٰ آثَرِهِ عَلَيْنَا“ کے الفاظ سے اہل بیعت کو گویا کہ باندھ لیا، کیونکہ یہ فیصلہ اور اختیار صاحبِ امر کا ہوتا ہے کہ وہ کس کے حوالے کوئی ذمہ داری کرتا ہے۔ چنانچہ بیعت میں یہ شرط بھی شامل ہو گئی کہ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے ہم اطاعت کریں گے۔

اب جماعتی نظام میں ماتحت امراء کا ایک نظام بتا کر یہ ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی ماتحت امراء تھے۔ آپ کوئی جیش بھیجتے تو اس کا کسی کو پہلا مالدار مقرر فرماتے۔ پھر کسی ایک ہی لشکر میں مختلف دستوں کے مختلف امراء ہوتے تھے، محمد کا امیر کوئی اور، میرہ کا کوئی اور، قلب پکوئی اور، اور ہراول دیتے کا کوئی اور ہوتا۔ غزوہ احد میں ورے پر جو پچاس تیر انداز مقرر کئے گئے ان پر بھی ایک امیر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ یہ بیعت بھی لی گئی کہ ”وَعَلَىٰ أَنْ لَا تَنْتَابِعَ الْأَمِيرَ أَهْلَهُ“ یعنی جو بھی صاحب امر ہوں گے، ماتحت امراء ہوں گے، ان سے ہم امر کے معاملے میں جھگڑیں گے نہیں، وہ جو حکم دیں گے ایسے بھی مانیں گے۔ اس میں وہ استثناء ہر حال موجود ہے، لہذا وہ محض حکم نہیں دے سکتے، دس بارے میں ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ماتحت امراء کا معاملہ، چاہے وہ حضور ﷺ کے زمانے میں تھا، اور حضور کے انتقال کے بعد چاہے مسلمانوں کا کوئی خلیفہ ہو اور چاہے کسی جماعت کا امیر ہو، سب کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ ان کی اطاعت اللہ اور رسول کے احکام کے دائرے کے اندر اندر ہوگی اور یہ اس سے باہر نہیں جاسکتے، اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف حکم نہیں دے سکتے۔

اس حدیث میں آگے الفاظ آئے ہیں: ”إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ فِيهِ مِنَ اللَّهِ بَرَهَانٌ“۔ یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت میں نہیں ہیں، صرف صحیح مسلم کی روایت میں ہیں۔ پھر یہ بھی نوٹ کیجئے کہ یہاں صیغہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے تک کے الفاظ بیعت کرنے والوں کی طرف تھے، صحیح مسلم کے صیغہ میں ہیں، لیکن اس فقرے میں جمع مخاطب کا صیغہ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حق الفاظ کا انشاء رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ فِيهِ مِنَ اللَّهِ بَرَهَانٌ“ ”سو اے اس کے کہ تم دیکھو کوئی کھلا کفر جس کے لئے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل موجود ہو“۔ یعنی تمہیں ثابت کرنا ہو گا کہ یہ بات کتاب و سنت کے منافی ہے، یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے، یہ کفر ہے، اس لئے میں نہیں مانوں گا جیسے کہ وہ معاملہ ہوا کہ امیر نے خود کشی کا حکم دیا کہ آگ کے گڑھے میں کود جاؤ، لیکن مابورین نے اسے ماننے سے انکار کر دیا

اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اگر کہیں وہ اس آگ میں کود گئے ہوتے تو کبھی اس سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔

اس بیعت میں آخری بات یہ ہے کہ ”وَعَلَىٰ أَنْ تَقُولَ بِالْحَقِّ إِنَّمَا حُكِّمْنَا“ یعنی ”اور یہ کہ ہم حق بات کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے۔“ حق بات کہنا اور صحیح مشورہ دینا اپنی جگہ پر بہت اہم ہے، کسی بھی صورتِ اجتماعی میں اس کا ایک نظام موجود ہونا ناگزیر ہے اور اس کے بغیر کوئی جماعتی زندگی صحیح اور صالح نہیں رہ سکتی۔ امیر کا انداز حکمانہ نہیں ہو چاہئے بلکہ اسے باہمی مشورے سے معاملات طے کرنے چاہئیں۔ چنانچہ بیعت کی بنیاد پر بننے والی عظیم میں بھی مشورہ کا نظام ملازی ہے۔ ”لَا تَصَافُ فِي الْمَلِكِ لَوْمَةٌ لِإِيمَانٍ“ یعنی ”ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔“ کوئی شخص یہ سمجھتے ہوئے کہ میری حیثیت ہی کیا ہے اور میں کچھ کہوں گا تو لوگ اس پر ہنس پڑیں گے، خاموش رہے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ اسے کسی سے ڈرنا نہیں چاہئے بلکہ اس کی جو رائے ہے وہ دہانتداری کے ساتھ پیش کر دینی چاہئے۔ البتہ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلام کے ظہور و امتداد میں فصلہ و دشواری کی گنتی سے نہیں ہونا۔ ”کہ از مغز دو صد خز گزرا نسلانی آید“ یعنی دو سو گدھوں کے دماغوں سے ایک انسان کا ذہن وجود میں نہیں آتا، اقبال نے اس شعر میں بڑی سیدھی سی بات بیان کر دی ہے۔ مصرعہ اولیٰ ہے ”مگر بے از طرز جموری نظام بختہ کارے شوا“ یعنی یہ جو مشرب کا تصور جمہوریت ہے کہ وہ دونوں کی گنتی سے معاملات طے کئے جائیں اس سے بچو، اسلامی ظہور جماعت میں باہمی مشورے کے بعد فیصلہ کا اختیار صاحبِ امر کو حاصل ہوتا ہے۔

### بیعت کا موقع و محل

اس بیعت صحیح و طاعت کے بارے میں ایک اہم بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بیعت مکہ میں نہیں کی۔ یہ بیعت اگرچہ کئی دور میں ہی ہوئی ہے، لیکن سمجھ لیجئے کہ یہ کس مرحلے پر ہوئی ہے۔ کہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر ایمان لانے

والے تعداد میں بہت کم تھے۔ پھر چونکہ سب مسلمان ایک ہی شہر میں تھے لہذا سب کو واسطہ و تعلق حضورؐ کے ساتھ براہ راست تھا۔ آپؐ کا ہر حکم ہر ایک کو براہ راست پہنچتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی عظامِ رسل کی ضرورت ہوتی تھی۔ حضرت خبابؓ بن ارت اور عمار بن یاسرؓ جیسے حضرات واپارِ قم میں حضورؐ کے پاس آمد وقت موجود رہتے تھے اور جو نئی کوئی وحی نازل ہوتی یہ مکہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں میں پہنچ کر تازہ ہاڈل ہونے والی قرآنی آیات کی تعلیم دیتے۔ اس کے علاوہ اور کسی درمیانی نظم کی ضرورت نہیں تھی، لہذا کوئی ماتحت امراء نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے مکہ میں ایمان لانے والے صحابہ سے بیعت نہیں لی۔ لیکن جب یثرب سے لوگ آپؐ کی دعوت پر ایمان لانے لگے اور ایک سال میں چھ افراد ایمان لائے، دوسرے سال وہ بارہ ہو گئے اور تیسرے سال میں جب بہتر (۷۲) افراد حلقہٴ گوشِ اسلام ہو گئے تب آپؐ نے ان سے مذکورہ بالا الفاظ میں بیعت لی اور ان میں سے بارہ کو ان پر نقیب مقرر کر دیا۔ ہم نے تنظیمِ اسلامی کے ماتحت نظم میں ”نقیب“ کا لفظ وہیں سے لیا ہے۔ نیز قرآن مجید میں بھی مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں پر بارہ نقباء مقرر تھے، یعنی ہر قبیلے پر ایک نقیب تھا۔ نقیب کے معنی ہیں خبر گیری کرنے والا، دیکھ بھال کرنے والا، نگرانی کرنے والا۔ تو حضورؐ نے بہتر میں سے بارہ افراد کو نقیب مقرر کر دیا، گو یا ہر نقیب کے حوالے پانچ پانچ مسلمانوں کو کر دیا کہ وہ ان کے حالات کی خبر گیری کرے، ان کی نگرانی اور رہنمائی کرے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ان بہتر افراد کا حضورؐ سے براہ راست رابطہ نہیں تھا۔ وہ تو اگلے سال حج ہی کے موقع پر آئیں گے تو ملاقات ہوگی۔ تو گویا کہ درحقیقت یہ بیعت ایک ایسے نظمِ جماعت میں لی گئی جس میں کچھ درمیانی امراء اور عمدیدار بھی ہوں اور ہر صاحبِ ایمان کا براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رابطہ نہ ہو۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی حدیث کو تنظیمِ اسلامی کے لئے بیعت کی بنیاد بنایا ہے۔ اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ نظمِ جماعت کے لئے صرف اس ایک حدیث کے اندر مکمل دستور موجود ہے۔ ہم نے اگرچہ تشریح و توضیح کے لئے اس کا ایک تفصیلی ڈھانچہ بھی بنایا ہے، اس کے قواعد و ضوابط بھی طے کئے ہیں اور نظامِ العمل بھی ترتیب دیا ہے، لیکن اس سب کا دار و مدار درحقیقت اسی پر ہے۔ اسی حدیث سے استنباط اور استدلال کرتے ہوئے ہم نے اپنا

جماعتی نظام تشکیل دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ”وَاسْمَعُوا  
 وَأَطِيعُوا“ اور ”أَمْرُكُمْ بِحَمِيسٍ يَا جَمَاعَةُ وَالسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ  
 وَالْمَحْرُوقُ وَالْجِهَادُ غَنَى سَبِيلِ الْمَلَأَةِ“ اور پھر اس مع و طاعت کے لئے یہ  
 مسنون بیعت مع و طاعت جو تعلق علیہ اطاعت سے ثابت ہے ہم ان سب تقاضوں کو  
 پورا کرنے کی کوشش کریں۔ آمین ۲

بَارِكُوا لِلَّهِ وَلِكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ وَنَفَعْتُمْ وَأَيُّكُمْ  
 بِالْآيَاتِ وَالَّذِي كَرَّمَ الْحَكِيمِ ۝۰

